Vol. 6 No.1 2022

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

انتظار حسین کے کالموں میں تہذیبی وسیاسی عناصر

Cultural and Political Elements in the Columns of Intazar Hussain

قربان علی
پی ایچ ڈی اُردو (سکالر) اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ڈاکٹر محمد امجد عابد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی اف ایجوکیشن لاہور
عبدالرحیم
پی ایچ ڈی اردو (سکالر) اورینٹل کالج یونیورسٹی اف دی پنجاب لاہور

Abstract:

Intazar Hussain being the most prominent Urdu column writer of his age introduced novel metaphors in political and cultural canvas of Asia. The focus of this article is to explore the vision of Intazar Hussain regarding reflection of Civilization and political vision through columns. His effort to bridging the gap between cultural folk tales and religion is marvelous which is highlighted in the article. Intazar Hussain found his voice early in his literary career in depicting characters that were in search of an identity and lost dreams. But migration is a theme of world literature and with conflicts making it a global issue.

Key words: Column, Journalism, Intazar Hussin, Political, Cultural, Contemporary Consciousness, Islamic History

کلیدی الفاظ: کالم، صحافت، انتظار حسین، سیاسی، تہزیبی، عصری شعور، اسلامی تاریخ

مطبوعہ صحافت میں کالم نگاری کا فن عروج پر پہنچ چکا ہے بعض قارئین صرف کالم کے مطالعہ کیلئے اخبارات خریدتے ہیں۔ کالم کسی اخبار میں مستقل عنوان کے تحت شائع ہونے والی با تصور تحریر ہے، جس میں کسی فردِ واحد کا نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر کسی مسئلے اور تازہ ترین صورتحال سے متعلق ہوتا ہے۔ کالم کے لغوی معنی "ستون"، "کھمبا"، "مینار" یا "صفحے کا حصہ" کے ہیں۔ اس کے علاوہ کالم سے فوج کی قطار بھی مراد لی جاتی ہے۔ اردو کالم نگاری کی بات کی جائے تو ابوالکلام آزاد اس سلسلے میں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے۔ ان کے بعد عبدالمجید سالک، ظفر اقبال، ناصر زیدی، امجد اسلام امجد، محمد اظہار الحق، خالد مسعود خاں، مستنصر حسین تارڑ، سعود عثمانی، جاوید چوہدری، حسن نثار، عباس اطہر، انور مسعود اور انتظار حسین وغیرہ نے کالم کی روایت کو مزید مستحکم کیا ہے۔ انتظار حسین نے جس طرح دیگر اصناف ادب میں اپنی حیثیت کا لوہا منوایا ہے، اسی طرح کالم نگاری بھی ان کی ایک شناخت بن چکی ہے۔ انھوں نے آفاق، مشرق، لیل ونہار، ایکسپریس میں اردو کالم لکھے، جبکہ Civil Military Magazine، Frontier Post اور Daily Dawn میں ان کے انگریزی کالم شائع ہوئے۔ ان اخبارات کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں بھی ان کے کالم شائع ہوتے رہے۔ لیکن روزنامہ "مشرق" میں ان کے کالموں کا سفر پچیس سال تک جاری رہا۔ مشرق کے کالموں کا انتخاب "ذرے" کی صورت میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس کے علاوہ "ملاقاتیں"، "بوند

Vol. 6 No.1 2022
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

بوند"، "قطرے میں دریا" اور "قصہ کوتاہ" ان کے کالموں کے دیگر مجموعے ہیں۔ انتظار حسین کی زندگی کا ایک بڑا حصہ لاہور میں بسر ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں میں لاہور شہر کی تصویروں کے مختلف رُخ موجود ہیں۔ ان میں ادبی مجلسوں کا آنکھوں دیکھا حال، رفتگاں کے نوحے، بدلتے فیشن کا احوال، اہم شخصیات سے ملاقاتیں، سیاست، فن، آرٹ، موسموں کی تبدیلی، کلچر کا زوال، سقوط ڈھاکہ کی کہانی اور ٹی ہاؤس کی رونقوں کے نقوش جابجا نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی کالموں میں اہم ادبی شخصیات سے ملاقات اور کتابوں پر تبصرے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ انتظار حسین کے اردو کالم اپنے موضوعات کی بناء پر انگریزی کالموں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں یونس حسن لکھتے ہیں:

> "انتظار حسین نے صحافت کے میدان میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ ان کی صحافت کا سفر پچھلے ساٹھ سالوں پر محیط نظر آتا ہے۔ انھوں نے مختلف اخبارات میں مسلسل کالم لکھے۔ انھوں نے "لاہور نامہ" کے عنوان سے روزنامہ "مشرق" میں ایک طویل عرصے تک کالم لکھا، اس کالم کے ذریعے جہاں انھوں نے حالات حاضرہ کو اپنے کالم کا موضوع بنایا وہاں لاہور، اس کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور تمدنی زندگی اور یہاں کی عملی وادبی سرگرمیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ گویا ان کا کالم لاہور اور اہلِ لاہور کی زندگی کا وہ آئینہ ہے جس کے اندر لاہور کے پچھلے ساٹھ سالوں کی تاریخ موجود ہے۔" (۱)

انتظار حسین ایک حساس ادیب تھے جس کی وجہ سے انہیں فطرت کی ہر چیز عزیز تھی۔ درختوں اور پرندوں کے ساتھ ان کا یارانہ بڑا پرانا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا بچپن درختوں اور پرندوں سے موانست میں گزرا ہے۔ انتظار حسین جب کسی درخت پر آرا چلتا دیکھتے ہیں تو انھیں ایک اچھے دوست کی محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کالم اس درد کو واضح کرتا ہے جو ان کے باطن میں موجود ہے۔ ان کے خیال میں انسانوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے، وہ ان درختوں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ درختوں کے حقائق میں کوئی مظاہرہ تک نہیں ہوتا مگر انتظار حسین جس کرب میں مبتلا ہوتے ہیں اسے ضرور رقم کرتے ہیں۔ اپنے کالم "درخت کی شہادت" میں اس درخت کی درماندگی کا رونا روتے ہیں جو توسیع شہر کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔ یہ درخت یونیورسٹی کا امین تھا مگر بے حس لوگوں کو اس کا وجود ایک آنکھ نہ بھایا۔

> "پنجاب یونیورسٹی کے سر سے اس بزرگ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ یہاں گیٹ کے برابر ایک اونچا گھنا درخت بہت زمانے سے کھڑا تھا۔ اس یونیورسٹی میں بہت سے وائس چانسلر آئے اور چلے گئے مگر یہ وائس چانسلر اپنی ایک وضع کے ساتھ قائم تھا اور یونیورسٹی کی باوقار روایت کا حصہ بنا ہوا تھا۔ اس ہفتے عجب افتاد پڑی کہ سڑک کی توسیع کی فکر کرنے والوں نے اس پر آرا چلایا اور اس صاحب منزلت مقتول کی لاش کئی دن تک مال روڈ پر پڑی رہی۔" (۲)

تہذیب کا زوال انتظار حسین کے کالموں کا ایک اہم موضوع ہے۔ اسی وجہ سے وہ ماضی میں ڈبکیاں لگاتے ہیں اور گمشدہ چیزوں کا موازنہ حال کی اشیاء سے کرتے ہیں۔ ماضی کی ہر چیز انہیں پسند ہے، جب حال میں انہیں وہ نظر نہیں آتی تو ان کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ انتظار حسین اس وقت کو ذہن میں لاتے ہیں، جب ٹھنڈک کا سامان پیدا کرنے کے لیے ریت اور خس کی ٹٹی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ گرمیوں میں ریت پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا تھا جس سے کمرے میں گرمی کم لگتی تھی۔ اس طرح خس کی ٹٹی میں جو مہک موجود تھی، وہ ہوا کے ساتھ ساتھ گھر کے مکینوں کو سُلا دیتی تھی۔ انتظار حسین کے خیال میں اس تہذیب کا خاتمہ بجلی کے پنکھوں اور ایئر کنڈیشن کی بدولت ہوا۔ یہ سہولتیں اب جابجا ہیں، ان کے آنے سے انسان کی زندگی بدل گئی ہے مگر وہ خوشبو ندارد ہے جو خس کی ٹٹی سے پیدا ہوتی تھی۔ صنعتی تہذیب نے ہمارے روایتی ماحول کو سلب کر لیا ہے۔ انتظار حسین خس کی ٹٹی کی گمشدگی پر نالاں نظر آتے ہیں۔

> "مگر پھر بجلی کا پنکھا آ گیا۔ جھالر والا پنکھا رخصت ہو گیا۔ مگر خس کی ٹٹی نے بجلی کے پنکھے کے ساتھ بھی کسی نہ کسی حد تک گزارا کیا۔ مگر بجلی کے پنکھے جتنے عام ہوئے خس کی ٹٹی زوال کرتی چلی گئی۔ ایئر کنڈیشننگ نے خس کی ٹٹی کے تابوت میں آخری کیل گاڑھی۔ یوں بھی ایئر کنڈیشننگ اس شہر میں عام نہیں ہے۔ محض اس کے تصور سے خس کی ٹٹی کو ہم نے فالتو قرار دے دیا ہے۔" (۳)

Vol. 6 No.1 2022
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

انتظار حسین جس تہذیب کی بازیابی چاہتے ہیں اس کا سرا انھیں دور تک کہیں نظر نہیں آتا۔ان کے نزدیک انگریزی تہذیب نے ہماری تہذیب کا قلع قمع کر دیا ہے۔یہ انگریزی تہذیب اپنی تابانیوں سے ملک میں فروغ تو پا سکتی ہے، مگر ہماری آنکھوں کو خیرہ نہیں کر سکتی۔آج ہمارے باغوں میں گوں نہ گوں پھول تو کھلے نظر آتے ہیں مگر ان میں خوشبو ناپید ہے۔انگریزی پھول اپنی خوبصورتی سے دلوں کو لبھانا چاہتے ہیں لیکن خوشبو کی عدم دستیابی نے ان کی شہرت کو بٹہ لگا دیا ہے۔ہمارے باغیچوں میں سے چنبیلی کے پھول کی گمشدگی بھی انتظار حسین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔چنبیلی جسے قومی پھول کا درجہ ملا تھا، ہمارے جدت پسند طبقے نے اس سے مخاصمت برتی اور اپنے باغیچوں سے اسے معدوم کر دیا۔ان کا یہ قبیح فعل قومی شعور کے منافی ثابت ہوا۔انتظار حسین کا دل چنبیلی کے پھول کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر کڑھتا رہا، کیونکہ وہ اسے بہار کا ایک تحفہ اور قومی تہذیب کی علامت سمجھتے تھے۔جس کی بدولت گھر کا آنگن مہکتا تھا، مگر بدیسی پھول کی آمد نے ہمیں تہذیب کی روایت سے بعید کر دیا ہے، گویا چنبیلی کے پھول کی گمشدگی کے ساتھ ہماری شناخت بھی لاپتہ ہو چکی ہے۔انتظار حسین کو پھولوں کی موجودہ تہذیب میں اپنایت نظر نہیں آتی، وہ اسے کلچر کا زوال تصور کرتے ہیں۔

> ''تہذیبیں اپنے پھولوں سے پہچانی جاتی ہیں مگر پاکستان کی نئی تہذیب انگریزی پھولوں سے پہچانی جاتی ہے۔اجلے مہکتے پھول ہوا اور مٹی کے ایک مخصوص رنگ انسانوں کے ایک مخصوص مزاج کے نمائندے ہیں۔اب یہ سب پھول سر جھکا چکے ہیں اور چنبیلی جسے قومی پھول قرار دیا گیا تھا ہمارے درمیان سے یوں گم ہے جیسے قومی شاعر گم ہو۔اب بے خوشبو رنگ برنگے انگریزی پھول نئے بھڑکیلے لاہور کی بہار ہیں۔''(۴)

انتظار حسین اپنے کالموں کے ذریعے ہمارے انفرادی رویوں کو بھی واضح کرتے ہیں۔ان کے خیال میں آج کا انسان معاشرے میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔اس کے رہنے سہنے کے انداز تبدیل ہو چکے ہیں۔اس سلسلے میں میں طبقہ اشرفیہ کو مورد الزام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اس طبقے نے باورچی خانو کا ماحول تبدیل کر دیا ہے۔اب سے کچھ سال قبل رسوئی میں سے جب دھواں نکلتا تھا تو پتہ چل جاتا تھا کہ یہاں کوئی اقامت پذیر ہے۔اس وقت کپڑے ہاتھوں سے دھوئے جاتے تھے مگر آج کے مشینی دور نے انسان کو جن آسائشات سے نوازا ہے ان کی موجودگی میں گھر سائیں سائیں کرتے ہیں۔مزید براں ان گھروں میں رہنے والے بچے بھی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔بچوں پر بے جا پابندیاں لگا دی جاتی ہیں کہ مٹی سے دور رہے۔ایک عرصہ پہلے مائیں بچوں کو زمین پر چھوڑ کر کام کاج میں مصروف ہو جایا کرتی تھیں، بچہ جب مٹی میں کھیلتا تھا تو تندرست و توانا بن جاتا تھا۔انتظار حسین کے نزدیک طبقہ اشرفیہ روایات سے جتنا دور ہو گیا ہے اتنا ہی مسائل کا شکار بنا ہے۔معاشرے کے دوسرے افراد سے لاتعلقی نے انہیں خود غرض بنا دیا ہے۔اگرچہ انہوں نے بچوں کی دلچسپی کے سامان گھر میں بنا لیے ہیں۔مگر تنگ ماحول نے ان گھروں کے بچوں کو لاغر کر دیا ہے۔انتظار حسین اس گھریلو ماحول کا رونا ان الفاظ میں روتے ہیں:

> "باورچی خانوں میں سے دھواں کیونکر اٹھے کہ بجلی کے چولہے جل گئے اور باورچی خانوں کی ساخت بدل گئی اور کپڑے ان گھروں میں دھوئے بھی جاتے ہیں تو وہ اس طرح نہیں سکھائے جاتے کہ آتے جاتے لوگ انھیں دیکھیں۔مگر سب سے تعجب کی خیز بات یہ ہے کہ یہاں بچے کسی صورت نظر نہیں آتے نہ کھیلتے ہوئے نہ لڑتے ہوئے اور نہ روتے بسورتے ہوئے ۔اس دیس کے بچے صدیوں سے مٹی میں لوٹتے پوٹتے چلے آرہے ہیں۔بوڑھی عورتیں اس کی حکمت یہ بتایا کرتی تھیں کہ مٹی سے بچے کا جسم فربہ ہوتا ہے مگر جی او آر کے علاقہ میں مٹی کہیں نہیں ہے۔"(۵)

ذرائع آمد و رفت نے جہاں پوری دنیا کو ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا ہے وہاں اس کے شور اور دھوئیں سے ماحول بھی آلودہ ہو چکا ہے۔انتظار حسین نے اپنی زندگی میں اکوں، تانگوں اور ٹم ٹم سے سفر کا مزہ بھی چکھا تھا۔لہذا جدید ذرائع نقل و حمل میں انہیں وہ تشفی نظر نہیں آتی۔دوسری اہم بات ان کے خیال میں وہ خاموشی ہے جس کا وجود اب فنا ہو چکا ہے۔خاموشی نے انسان کے مرتبے میں اضافہ کیا، مگر وہی خاموشی آج ذرائع آمد و رفت کے شور تلے دب کے رہ گئی ہے۔خاموشی سے انسان کے باطن کا سراغ لگایا جاتا تھا، کیونکہ اس کا تعلق انسان کی ذات سے جڑا ہوا تھا۔کچھ عرصہ پہلے جنگلوں میں خاموشی کے باعث مخلوق آسودہ حال تھی۔علاوہ ازیں بستیوں میں مقیم افراد بھی مرفہ الحال تھے، لیکن انسان کی سعی لاحاصل اور ٹریفک نے بستیوں اور جنگلوں سے سکون چھین لیا ہے۔انتظار حسین کو اس بات کا قلق ہے کہ جب انسان کا سابقہ دشت و در کی خاموشی سے پڑا تھا تو وہ ارتقا کی

Vol. 6 No.1 2022
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

منزلیں طے کرتا چلا گیا، مگر جونہی خاموشی نے اپنا بستر گول کیا تو وہی انسان بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ اگرچہ جدید ذرائع آمد و رفت سے میلوں کی مسافتیں طے ہو گئی ہیں مگر فطرت کا سکون برباد ہو گیا ہے۔

"دشت و در کی خاموشی نے آدمی کو ڈرایا بھی بہت اور مالا مال بھی بہت کیا۔ دشت و در کی خاموشی نے پیغمبر پیدا کیے۔ حکیم و دانا پیدا کیے۔ خاموشی آدمی کیلئے بہت بڑا چیلنج تھی۔ اس میں اسے اپنی ذات کم ہوتی نظر آتی تھی۔ اپنی ذات برقرار رکھنے کی کوشش تخلیقی عمل بن گئی۔ خاموشی نے آدمی کو فلسفہ حکمت سے نوازا، شاعری کی دولت بخشی، عشق سے مالا مال کیا۔ رکشا، موٹر سائیکل، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، خلائی جہاز، راکٹ، آدمی اب شور کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جنگل اب سائیں سائیں نہیں کرتے اور بستیوں کے دن رات اب خاموش نہیں ہیں۔"(۶)

انتظار حسین اپنے کالموں میں طنز کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ یہ طنز زیادہ تر آج کل کے فیشن اور مشرقی حیاء سے کنارہ کشی کو نشان زد کرتا ہے۔ خواتین میں دوپٹے کی تبدیلی انہیں کشیدہ خاطر کر دیتی ہے۔ انہیں اس دوپٹے سے سخت نفرت ہے جو خواتین کے سر پر نہیں ٹھہرتا۔ دوپٹہ ہماری مشرقی حیا کا ضامن ہے، لیکن عصرِ حاضر میں خواتین اب صرف اسے فیشن کی حد تک گلے کا ہار بناتی ہیں اس سے پردے کا کام لینا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ انتظار حسین فیشن کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ عورت کی اصلاح چاہتے ہیں۔ عورت کے فیشن میں جو بات انہیں ناگوار گزرتی ہے اس کا اظہار برملا کرتے ہیں۔ معاشرے میں تہذیبی اقدار کا فروغ ان کا کلیدی نقطہ نظر ہے۔ انتظار حسین معاشرے میں ایسی قدروں کا نفاذ نہیں چاہتے ہیں جو ہمیں روایت سے بیگانہ کر دیں۔

"چنا ہوا دوپٹہ سر اور سینے کو ڈھانپتا تھا جب یہ دوپٹہ غائب ہوا اور پٹی کی صورت والا دوپٹہ آیا تو سر کو ڈھکنے کا تصور غائب ہو گیا ۔ دوپٹہ کیسا بھی ہو وہ سر پر نہیں سجتا۔ سر پر دوپٹہ سجانے کی روایت فراموش تو نہیں ہوئی ہے مگر اس کی تھوڑی سی تخصیص ہو گئی ہے۔ اب دوپٹہ اذان کی آواز اور قرات کے ساتھ سر پر سجتا ہے اور باقی اوقات میں وہ سر پر ہار نہیں بنتا، کاندھوں کی زینت ہوتا ہے۔"(۷)

انتظار حسین کا عصری شعور نہایت بالیدہ ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ عصری مسائل کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اکیسویں صدی جیسے ہی شروع ہوئی ہمارے ملک میں دہشت گردی کے بادل منڈلانے لگے۔ اس سلسلے میں ٹارگٹ کلنگ، خودکش دھماکے، اغواء اور ڈکیتی نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان کا وقار بھی عالمی سطح پر گیا ہے لیکن آئے روز ہونے والے خودکش دھماکوں نے ہمیں نڈر بنا دیا ہے۔ انتظار حسین اپنے کالموں میں ان انفرادی کاری ضرب لگاتے ہیں جو ان دھماکوں کا ذمے دار امریکہ کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ لوگ بجائے ڈھارس بندھانے کے عجیب و غریب تبصروں سے دوسروں لوگوں کو پریشان کر دیتے ہیں۔ انتظار حسین موجودہ دور کا موازنہ اس دور سے کرتے ہیں جس میں انسان کسی کو خون میں غلطاں دیکھتے تھے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ لیکن آج کا انسان "مشکلیں مجھ پر اتنی پڑیں کہ سب آساں ہو گئیں" کا قائل ہے۔

"وہ زمانہ گیا جب کوئی بڑی واردات ہو جاتی تھی تو خلقت دہل جاتی تھی اور ہفتوں، مہینوں دل دہلے رہتے تھے۔ اب خودکش حملوں نے ہمیں خطروں کے بیچ زندہ رہنے کے آداب سکھا دیے ہیں۔ خیر عام خلقت خودکش حملوں کے بعد تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور دہل جاتی ہے۔ دادِ ان یاروں کو ملنی چاہیے جو ایسی واردات کے فوراً بعد ایک ہی راگ دینا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ ہماری جنگ نہیں ہے۔ پاکستان امریکہ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ادھر جان سے جانے والوں کے گھروں میں صف ماتم بچھی ہوتی ہے۔ ہوائیں اور یتیم بچے بلک بلک کر رو رہے ہوتے ہیں اور سیاسی مبصرین ثابت کر رہے ہوتے ہیں کہ سرفروش کس طرح امریکہ کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ پاکستان خواہ مخواہ بیچ میں کُود پڑا ہے۔"(۸)

Vol. 6 No.1 2022
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

موجودہ دور میں ہم جن مسائل سے دوچار ہیں، ان میں ایک اہم مسئلہ مہنگائی ہے۔ آئے روز چیزوں کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ انتظار حسین نے بھی اس مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ان دکانداروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں جب کسی چیز کی اہمیت کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو اس کے دام بڑھا دیتے ہیں۔ انسان کی بے بسی دیکھیے کہ اسے چار و ناچار وہ چیز خریدنی پڑتی ہے۔ معاش کے چکر میں ہم پس کر رہ چکے ہیں، مزید یہ کہ مہنگائی نے ہمیں لاچار کر دیا ہے۔ انتظار حسین اپنے کالم "مٹکے نے بھی اپنا لوہا منوالیا" میں دکانداروں کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ جن میں خلق کا احساس ندارد ہو چکا ہے۔ وہ مجبوری سے فائدہ اٹھانے میں پیش پیش ہیں۔ مہنگائی کا یہ وبال انہی کا پیدا کردہ ہے۔ اس حوالے سے انتظار حسین لکھتے ہیں:

> "کل شام یہاں پہنچے لیکن جو سب سے بڑی اور دھماکہ خیز خبر سننے کو ملی وہ یہ تھی کہ لاہور میں کم از کم 36 گھنٹے پانی اور بجلی بند رہے گی۔ اس وقت بھاگم بھاگ بازار گئے کہ گھڑے اور مٹکے میں ضرورت کے مطابق پینے کا پانی بھر کر رکھ لیں لیکن دو کانداروں نے جو پہلے ہی اس خبر سے آگاہ تھے مٹکے کے بھاؤ اتنے بتائے کہ ایک اکلوتے مٹکے کا بھاؤ سن کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ہم نے پھر وضاحت چاہی کہ واقعی ایک مٹکے کی قیمت سات روپے ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا صاحب کہو تو نو روپے، گیارہ روپے اور پندرہ روپے والا مٹکہ دکھاؤں۔ ہم نے کہا کہ مٹی کے بنے ہوئے ایک مٹکے کی قیمت ہے یا کسی پیتل کی بنی ہوئی گاگر کی قیمت۔ جواب ملا صاحب وہ وقت گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نہ خلیل خاں ہے اور نہ فاختہ ہی ہے۔ اس لیے آپ سات روپے والا مٹکا لے جائیے اور کل کی فکر کیجئے۔"(۹)

انتظار حسین ایک ایسے بیدار مغز صحافی اور ادیب ہیں، جن کی تحریروں میں وطن سے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان سے متعلق انہوں نے "کاروان جس نے ڈھاکہ سے آغاز سفر کیا تھا"، "ایک پاکستان، دو پاکستان، پانچ پاکستان" اور "توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا" جیسے معروف کالم تحریر کیے، جن کی ہر سطر میں وہ کرب موجود ہے، جو ہر پاکستانی کے دل و دماغ کو داغ داغ کر گیا۔ اصل میں انتظار حسین ہجرت کے مسائل سے پہلے ہی دوچار ہو چکے تھے۔ ایک سرحد سے کٹ کر دوسری سرحد جانے کا صدمہ انہیں پوری عمر یاد رہا۔ لہذا پاکستان کا دولخت ہونا انہیں مزید زخم خوردہ کر گیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے کالم لاہور کی تہذیبی زندگی کے علاوہ ملکی سیاسی اور جغرافیائی صورتحال کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ادیب چونکہ اسی آب و گل کا پروردہ ہوتا ہے۔ اپنے عہد کے پرآشوب حالات و واقعات پر اس کی کڑی نظر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر ان واقعات سے مزین ہوتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ سے متعلق ان کی حب الوطنی ملاحظہ ہو:

> "زوال ڈھاکہ کی کہانی سن کر لوگ گھروں سے نکل پڑے۔ پہلے ایک سکتہ طاری ہوا، ایک نے دوسرے کو متحیر نظروں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے، کیا ہو سکتا ہے۔ پھر آنکھوں میں آنسو امنڈنے لگے بیبیاں بیبیوں کے گھر گئیں پُرسا دیا اور آنچل سین منہ ڈھانپ کر روئیں۔ چائے خانوں میں یوں ہوا کہ قوم کے ساتھ جو دغا ہوئی ہے اس پر غیض و غضب میں گفتگو کرتے ہوئے کسی کا دل بھر آتا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں اور پھر اچانک محفل میں خاموشی چھا جاتی۔"(۱۰)

انتظار حسین جن دوستوں کی منڈلی میں بیٹھتے تھے، وہ بھی اس سانحہ پر خون کے آنسو روئے۔ یہی نہیں بلکہ کچھ دوست تو اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے اور موت کی آغوش میں چلے گئے۔ انتظار حسین نے اپنے کالموں میں اس ردعمل کا ذکر کرتے ہیں، جو اس سانحے کی بدولت سامنے آیا۔ ان کا قلم ملک کی وفاداری کا آئینہ دکھاتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے سانحے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر انتظار حسین نے جس طرح اس المناک سانحے کی تصویر کھینچی ہے وہ لائق تحسین ہے، کیونکہ تقسیم کا عمل انہیں ادھورا کر دیتا ہے۔

> "ایک بوڑھا شخص نسبت روڈ کے بیچ کھڑا روتا تھا اور کہتا تھا کہ لوگو مجھے بتاؤ کہ پاکستان کے ساتھ کیا ہوا، لوگ اس شخص کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ بوڑھے شخص کو سمجھا رہے تھے مگر وہ بدستور گریاں تھا اور کہتا تھا کہ

Vol. 6 No.1 2022
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

میں ایک ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ کوئی مجھے کیوں نہیں بتاتا۔ لوگو! میں کہاں جاؤں اور کس سے پوچھوں کہ پاکستان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"(۱۱)

انتظار حسین اسلامی تاریخ کے روشن پہلو کو بھی کالموں کا موضوع بناتے ہیں نیز اسلامی ملکوں کی سیاسی صورتحال سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ فلسطین میں شبِ معراج کی وہ رات انہیں نہیں بھولتی، جس رات یہودیوں نے ان پر شب خون مارا تھا۔ فلسطین میں مسلمانوں کی حالت زار سے وہ پریشان حال نظر آتے ہیں۔ ہر سال شب معراج کی جو چراغاں ہوتا ہے انہیں اس درد کی یاد دلاتا ہے، جو یہودیوں سے ملا تھا۔ انتظار حسین کے نزدیک مسلمان ایک دوسرے سے مخاصمت برت رہے ہیں۔ اگرچہ فلسطین میں جہادی گروپ نے اپنے علاقے واگزار کرانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی، مگر آگ اور خون کا جو کھیل یہاں شروع ہوا تھا، اس کی چنگاری تاحال بھڑک رہی ہے۔ دراصل انتظار حسین مسلمانوں کے اس خواب کا تذکرہ کرتے ہیں جو وہ ہر سال دیکھتے ہیں اور وہ یہ خواب مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خاتمے سے متعلق ہے۔ انتظار حسین ایک ایسے ذکی الحس ادیب ہیں، جو امت مسلمہ کے ہر دکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔

"برس کے برس معراج کی شب اس شہر میں اس طور چراغاں ہوتا ہے مگر ہاں ۱۹۶۷ء میں جب شب معراج آئی تو شہر میں کوئی چراغاں نہیں ہوا تھا اور مسجد اقصیٰ کے سفر افلاک کا نقطہ آغاز ہے جب یہودیوں کے تصرف میں گئی تھی۔ اس سوگوار شبِ معراج سے آج کی منور شبِ معراج تک عالم اسلامی نے کتنی باریک گھڑیاں گزاریں اور کتنے روشن خواب دیکھے۔ عالم اسلام نے مسجد اقصیٰ سے دھواں اٹھتے دیکھا اور صلاح الدین ایوبی نے فلسطین کے خاکستر سے چنگاری اٹھتے دیکھی۔ اس چنگاری کو شعلہ بنتے دیکھا۔ پھر انہیں فلسطینی فرزندوں کے ساتھ فلسطین میں جہاد کی آگ روشن کر رہے تھے۔ اردن کی سرزمین پر خاک و خون میں غلطاں دیکھا، ان کے اپنے ان کے دشمن بن گئے۔"(۱۲)

انتظار حسین تہذیب کی تشکیل میں عجلت کے مخالف نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی تہذیب آناً فاناً معرضِ وجود میں نظر نہیں آتی۔ جب تک حالات کے تھپیڑے اور وقت کی بے رحم موجیں اس پر اپنے اثرات مرتسم نہ کر لیں، تہذیب جنم نہیں لیتی۔ تہذیب کی مثال وہ اس عمارت سے دیتے ہیں جو اب قدیم ہو چکی ہے۔ اصل میں انتظار حسین کا موضوع روس میں مارکسی تہذیب کا قیام ہے۔ روس میں مارکسیت نے ایک عرصہ تک ن نپٹنے کی لا محالہ کوشش کی ہے، مگر اب وہاں اس کا پرچار ہوا ہے۔ انتظار حسین کے کالم میں جہاں ادبی تحریکوں کے آغاز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے وہاں دنیا میں ابھرنے والی تحریکیں کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہیں۔

"ایک بات اور ہے عمارت نئی نئی ہو تو بس وہ اینٹ گارے کا کھیل ہوتی ہے۔ مگر جب اس کی دیواروں پر رفتہ رفتہ کاہی جم جاتی ہے اور چڑیاں منڈیر پر بہت بیٹیں کر چکتی ہیں اور کنکرے آدمی بارش کے تھپیڑے کھا کھا کر تھوڑے بوسیدہ ہو جاتے ہیں ۔ تب وہ عمارت تہذیب بنتی ہے ۔ لگتا ہے روس میں مارکیٹ کی عمارت پر کاہی جمنی شروع ہو گئی ہے اور چڑیوں نے منڈیروں پر بیٹیں کرنی شروع کر دی ہیں۔"(۱۳)

اگرچہ انتظار حسین کی شہرت بہ طور ایک ادبی کالم نگار ہے مگر واضح رہے کہ انھوں نے سیاسی موضوعات کو اپنے کالموں میں جگہ دی ہے۔ سیاست ایک ایسا شعبہ ہے جس سے متعلق ہر فرد کی آراء مختلف نظر آتی ہے۔ انتظار حسین نے بھی اپنے کالموں میں ملکی سیاست کو موضوع بحث بنایا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ سیاست میں وہ کسی کے بخیے ادھیڑنا نہیں چاہتے۔ وہ صرف اشاروں اور کنائیوں کی مدد سے سیاسی موضوعات کو قلم بند کرتے ہیں۔ ان کا موضوع تو ادبی سرگرمیوں کا زوال اور مٹتی قدروں کی کھوج ہے۔ لہذا سیاست میں ان کی تحریریں میانہ روی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

"انھوں نے سیاسی موضوعات کو بھی گاہے، گاہے موضوع سخن بنایا ہے لیکن ان کے کالم ایسے ہیں جس میں کسی کی پگڑی اچھالنے کا اہتمام کیا گیا ہو اور نہ اپنے مخالف کو چٹکی بھرتے ہیں جس پر مخالف کے آنسو نکل آئیں۔"(۱۴)

Vol. 6 No.1 2022

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

انتظار حسین کے کالم موضوعات کے علاوہ فنی خوبیوں سے بھی مزین نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں روز مروں اور محاوروں کا استعمال بھی کرتے ہیں جن کی بدولت ان کا اسلوب جاندار بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اشعار کا استعمال اور فارسی تراکیب کا تذکرہ ان کے کالموں کی اضافی خوبی شمار ہوتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے کالموں میں ماضی کی جس تہذیب کا تذکرہ کیا ہے وہ ہماری ثقافت کی پہچان ہے جس سے رشتہ استوار کرنا ہماری تہذیبی بقا کا ضامن ثابت ہو گا۔

حوالہ جات

۱۔ یونس حسن، انتظار حسین ایک دبستان، مضمون، مشمولہ، ماہنامہ ادب لطیف، لاہور: جلد ۸۱، شمارہ ۷ جولائی ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۵

۲۔ انتظار حسین، ذرے، لاہور: پاکستان فاؤنڈیشن ۱۹۷۶ء، ص ۳۷

3۔ ایضاً، ص ۵۳۔۵۲

۴۔ ایضاً، ص ۶۲

۵۔ ایضاً، ص ۷۹

۶۔ ایضاً، ص ۸۰۔۷۹

۷۔ ایضاً، ص ۷۳

۸۔ انتظار حسین، قصہ کوتاہ، مرتب، آصف فرخی، ڈاکٹر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۴

۹۔ انتظار حسین، قطرے میں دریا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۴۔۱۶۳

۱۰۔ انتظار حسین، ذرہ، لاہور: پاکستان فاؤنڈیشن، ۱۹۷۴ء، ص ۲۶۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۱۔۸۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۹

۱۴۔ کوکب، عبدالغفار، ڈاکٹر، اردو میں فکاہی کالم نگاری، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۳